فکر و نظر---- اسلام آباد جلد:۴۰-۴۱ شمارہ:۴،۱

ڈاکٹر محمد حمیداللہؒ مرحوم کے چند تفردات

ڈاکٹر قاری محمد طاہر☆

ایک محقق غواص کی مانند ہوتا ہے جو گہرے پانی کی تہہ میں اُتر کر موتی تلاش کر کے لاتا ہے۔ اس کی ہر کوشش کسی نئے اور پہلے سے قیمتی گہر کی متلاشی ہوا کرتی ہے۔ ایک محقق بھی علم کے بحر ذخار سے موتی تلاش کرنے کی جستجو کرتا ہے جس کے نتیجہ میں اس پر عقدے بھی منکشف ہوتے ہیں اور اہدافِ علم کی نشاندہی بھی ہوتی ہے جو اسے مزید گہرائی میں اترنے کی دعوت دیتی رہتی ہے۔

ڈھونڈنے والے کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں

غواص اور محقق دونوں غوطہ خور ہیں۔ دونوں کا دائرہ عمل سمندر ہے، فرق صرف یہ ہے کہ ایک پانی کے سمندر میں اُترتا ہے دوسرا علم کے سمندر میں۔ ایک کا سمندر محدود دوسرے کا لامحدود۔ دونوں موتی تلاش کرتے ہیں ایک کے تلاش کردہ موتی انسانی جسم کی زینت بنتے ہیں جبکہ دوسرے کے موتی شعور و ادراک کو لازوال جلا عطا کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے محقق کی جولانی اور کاوش ابدی ہوتی ہے جبکہ غواص کی عارضی۔

ڈاکٹر محمد حمیداللہ عالم بھی ہیں، محقق بھی اور دریائے علم کے غواص بھی۔ وہ کسی بھی بات کو آنکھیں بند کر کے ماننے کے قائل نہیں ہیں۔ ہر معاملے میں تحقیق و جستجو کے بعد رائے قائم کرتے ہیں۔ اسی لئے انفرادیت کا حق بھی ان کو حاصل ہے۔ کیونکہ ہر صاحب علم تنقیص کا نہیں البتہ تنقید و تجدید کا حق ضرور رکھتا ہے جس سے علم کی نئی راہیں وا ہوتی ہیں۔ اسی حوالے سے ہم نے ڈاکٹر محمد حمیداللہ مرحوم کی سوچ کے نئے زاویوں کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے جو ان کے شہرہ آفاق ''خطبات بہاولپور'' سے ماخوذ ہیں۔

اسلام اور موسیقی

موسیقی کے بارے میں مسلمان اہل علم کی عمومی رائے اس کے عدم جواز پر ہے۔ اس کے بڑے

☆ مدیر، ماہنامہ ''التجوید'' فیصل آباد

قوی دلائل علماء نے پیش کئے ہیں لیکن اس بارے میں ڈاکٹر حمیداللہ مرحوم کا نقطہ نظر علماء کی عمومی رائے سے مختلف ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ:

''موسیقی کی اسلام میں مخالفت بالکل نہیں ہے اگر ممانعت ہے تو اس بات کی کہ مثلاً نماز کے وقت موسیقی کا شغل جاری رکھا جائے یا اس کا منشاء ایسی تفریح ہو جو اخلاقی نقطہ نظر سے بری سمجھی جاتی ہے''(۱)۔

اپنی اس رائے کی توثیق یا تائید میں ڈاکٹر صاحب بہت سی مثالیں پیش کرتے ہیں جو مختصراً درج ذیل ہیں:-

۱۔ رسول اکرم ﷺ نے حضرت بلالؓ کو اذان سکھائی اور یہ بتایا کہ کن لفظوں کو کھینچ کر ادا کرنا چاہئے اور کن الفاظ کو اختصار سے۔ اس طرح آپ نے گویا موسیقی کے سر بتائے۔

۲۔ ایک دن رسول اللہ ﷺ کسی کی دعوت ولیمہ میں تشریف لے گئے واپس آ کر حضرت عائشہؓ سے فرمایا:۔ اے عائشہ! میں آج تمہارے خاندان کے ایک فرد کی دعوت ولیمہ میں گیا تھا وہاں کوئی موسیقی نہیں تھی، یہ کیسی بات ہے؟(۲)

۳۔ حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہ ﷺ منیٰ میں مقیم تھے اور حضرت عائشہؓ کے خیمہ میں آرام فرما رہے تھے وہاں چند لڑکیوں نے دف بجانا شروع کر دیا۔ اس دوران حضرت ابوبکر صدیقؓ ملنے کے لئے آئے اور ان لڑکیوں کو ڈانٹتے ہوئے کہا کہ یہ شیطانی کام ہے بند کرو اور یہاں سے نکل جاؤ۔ رسول اللہ ﷺ نے سر اٹھا کر فرمایا، ابوبکر! آج عید کا دن ہے گویا آپؐ نے فرمایا کوئی ممانعت نہیں ہے(۳)۔

ان دلائل کی روشنی میں ڈاکٹر حمیداللہ فرماتے ہیں:-

''قرآن مجید کی تلاوت بھی موسیقی ہی کی ایک شاخ ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے احکام ہیں کہ قرآن کریم کو معمولی نثری عبارت کی طرح نہ پڑھو کہ ڈھول اڑانا سمجھا جائے بلکہ خوش الحانی سے پڑھو اور یہ بھی فرمایا ہے کہ اللہ نے کسی غناء کسی گانے کی اجازت اتنی نہیں دی ہے جتنی قرآن کو اچھی آواز سے تلاوت کرنے کی اجازت دی۔ ایک دوسری حدیث یہ ہے کہ خدا کسی گانے کی آواز پر اتنا کان نہیں دھرتا جتنا قرآن مجید کی اچھی آواز کے ساتھ تلاوت کرنے پر اپنے کان لگاتا ہے۔ غرض یہ کہ موسیقی کی کوئی اصولی ممانعت نہیں ہے بشرطیکہ موسیقی کا مقصد اچھا ہو اور اس میں ہماری مذہبی عبادت میں کوئی حرج واقع نہ ہوتا ہو(۴)۔

ڈارون کا نظریہ ارتقاء

ڈارون کا نظریہ ارتقاء مسلمانوں میں بہت موضوع بحث رہا اور ہے۔ عموماً اہل علم اس نظریئے کو اسلامی تعلیمات سے متصادم ہی قرار دیتے رہے ہیں جبکہ ڈاکٹر محمد حمیداللہ مرحوم کا نظریہ عموم اہل علم کے خیالات سے مطابقت نہیں رکھتا۔ ان کے نزدیک ڈارون کا نظریہ نیا نہیں بلکہ مسلمان اہل فکر کا ہی دیا ہوا ہے۔ اس ضمن میں وہ اخوان الصفا اور ابن مسکویہ کی ''الفوز الاصغر'' کا حوالہ دیتے ہیں اور ڈارون کو ملحد کہنے میں بھی متامل ہیں۔ آپ فرماتے ہیں:-

> ''ڈارون کا نظریہ ہمارے ہاں بعض اوقات اس لئے پیچیدگی پیدا کرتا ہے کہ ہم فرض کرتے ہیں کہ ڈارون ایک ملحد تھا۔ خدا کو نہیں مانتا تھا حالانکہ ڈارون کی سوانح عمری پڑھیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ خدا کا قائل تھا۔ جب اس نے اپنے آبائی فن علم طب کی تعلیم مکمل کر لی۔ ڈاکٹر بن گیا تو یکایک کایا پلٹ گئی۔ دنیا سے وہ نفور ہوگیا اور خدا کی طرف مائل ہوا۔ چنانچہ کیمبرج یونیورسٹی کے شعبہ الٰہیات میں اس نے عیسائی مذہب کی تعلیم حاصل کی جہاں طلباء کو تقابل ادیان (Comparative Religion) کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ یہاں ڈارون نے اسلام کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لئے عربی زبان بھی پڑھی۔ اس کے خطوط کا جو مجموعہ شائع ہوا ہے اس میں کئی خط اس نے اپنے عربی کے استاد کے نام لکھے ہیں اور بے حد ادب و احترام سے اس کا نام لیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس زمانے میں کیمبرج یونیورسٹی میں عربی نصاب کی جو کتابیں پڑھائی جاتی تھیں ان میں یا تو ''اخوان الصفا'' کے اقتباسات ہوں گے یا ابن مسکویہ کی ''الفوز الاصغر'' کے انتخابات۔ ان دونوں کتابوں میں ارتقاء کا نظریہ بیان کیا گیا ہے اور آپ کو معلوم کر کے حیرت ہوگی کہ ان مسلمان مولفوں کی زندگی میں کسی نے کوئی اعتراض نہیں کیا اور کبھی انہیں کافر قرار نہیں دیا گیا۔ اخوان الصفاء اور ابن مسکویہ کی الفوز الاصغر، تیسری چوتھی صدی ہجری کی کتابیں ہیں۔ ان میں لکھا ہے کہ خدا پہلے مادہ کو پیدا کرتا ہے اور اس مادہ کو ترقی کی قوت عطا کرتا ہے لہذا مادہ اولاً بخار یا دھوئیں کی صورت اختیار کرتا ہے پھر ترقی کرتے ہوئے پانی کی صورت اختیار کرتا ہے پھر ترقی کرتے ہوئے جمادات کی صورت اختیار کرتا ہے۔ جمادات ترقی کرتے ہوئے مختلف قسم کے پتھر بنتے ہیں اور بالآخر وہ مرجان کی صورت اختیار کرتے ہیں جو ہوتے تو پتھر ہیں لیکن ان میں درخت کی سی

شاخیں ہوتی ہیں۔ پھر جمادات کے بعد نباتات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ درخت ترقی کرتے جاتے ہیں اور سب سے آخری مرحلے میں ایسا درخت ملتا ہے جو جانور کی خصوصیات سے بہت قریب ہوتا ہے۔ یہ ہے کھجور کا درخت اور درختوں کے بالمقابل کھجور کے درخت میں نر اور مادہ الگ الگ ہوتے ہیں اور درختوں کے بالمقابل جن کی ساری شاخیں بھی اگر ہم کاٹ دیں تو درخت مرتا نہیں۔ کھجور کا سر کاٹ دیں تو وہ درخت مر جاتا ہے۔ اس لئے کھجور کے درخت کو اعلیٰ ترین پودے اور ادنیٰ ترین حیوان دونوں سے مشابہت ہے۔ پھر اس کے بعد ''ادنیٰ ترین قسم کا حیوان پیدا ہوتا ہے وہ ترقی کرتے کرتے کیا بنتا ہے؟ ابن مسکویہ بیان کرتا ہے اور ''اخوان الصفاء'' میں بھی وہی بیان کیا گیا ہے کہ وہ بندر کی شکل اختیا کر لیتا ہے۔ یہ ڈارون کا بیان نہیں، یہ مسلمان حکماء کا بیان ہے۔ پھر اس کے بعد ترقی کرتا ہے تو ادنیٰ قسم کا انسان بنتا ہے۔ وحشی انسان۔ وہ ترقی کرتے کرتے اعلیٰ ترین انسان بنتا ہے۔ یہ بشر ولی اور پیغمبر ہوتا ہے۔ پھر اس سے بھی ترقی کر کے فرشتہ بنتا ہے۔ پھر فرشتوں کے بعد ذات باری تعالیٰ خدا ہی کی ذات ہوتی ہے۔ ہر چیز خدا سے شروع ہو کر پھر خدا ہی کی طرف جاتی ہے۔ ''**والیہ المرجع والمآب**'' یہ ہے ہمارے حکماء کا بیان۔ جب یہ چیزیں مسلمان حکماء نے بیان کیں اور ان پر مسلمان فقہاء نے ان کی زندگی میں کبھی کفر کا فتویٰ نہیں دیا تو اس کو اسلام کے خلاف قرار دینا ایک غور طلب بات ہے۔ میں آگے چلتا ہوں قرآن مجید میں آدم علیہ السلام کی پیدائش کے متعلق یہ ضرور بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں مٹی سے پیدا کیا۔ ہمارا تصور یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک کمہار کی طرح مٹی کو لیتا ہے اور اس کی مورت بناتا ہے اس کے اندر روح پھونکتا ہے اور حضرت آدم علیہ السلام بن جاتے ہیں۔ ممکن ہے ایسا ہوا ہو۔ میں انکار نہیں کرتا لیکن ان آیتوں (۵:۲۲، ۱۱:۳۵، ۴۰:۶۷، ۱۸:۳۷) کو کیا کریں گے جن میں بار بار یہ کہا گیا ہے کہ اللہ نے انسان کو مٹی سے اور پھر نطفے سے پیدا کیا''۔ ظاہر ہے کہ مٹی سے کبھی نطفہ پیدا نہیں ہوتا۔ حیوان اور انسان سے نطفہ نکلتا ہے اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اللہ نے سارے درمیانی مدارج کی تفصیل کو وہاں حذف کر دیا او کہا کہ مٹی تمہاری اصل ہے اور تمہاری پیدائش کا آخری وسیلہ تمہارے باپ کا نطفہ ہے جو تمہاری ماں کے رحم میں رہتا ہے اور اس طرح تم پیدا ہو جاتے ہو۔ ایک اور آیت ۱۴:۷۱ کو لیجئے: ''**خلقکم اطوارا**'' (خدا نے انسان کو طور بہ طور پیدا کیا) ''طور''

وہی لفظ ہے جس سے تطور (Evolution) کا لفظ بنایا گیا ہے۔ خدا نے انسان کو طور بہ طور پیدا کیا۔ اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ خدا نے انسان کو اولاً جمادات کی شکل میں بنایا۔ پھر وہ جمادات ترقی کرتے کرتے نباتات بنتے ہیں۔ پھر حیوان بنتے ہیں۔ غرض اس میں کوئی تضاد نظر نہیں آتا۔ شاید آپ کی واقفیت کے لئے ایک چیز عرض کروں کہ آپ کی یونیورسٹی لائبریری میں ایک چھوٹا سا مضمون (یہ مضمون جامعہ ارض روم (ترکی) میں چھپا تھا۔ یہی کچھ نظرثانی کے بعد "**المصادر الاسلامیه لدار وین فی نظریه عن اصل الانواع**" کے عنوان سے اسلام آباد کے رسالے "الدراسات الاسلامیہ" میں ۱۹۸۱ء میں چھپا) عربی زبان میں آپ کو ملے گا جس کا عنوان ہے: "**خلق الکائنات و تطور الانواع حسب آراء المفکرین المسلمین**" اسے آپ دیکھ سکتے ہیں جس میں آپ کو یہ ساری تفصیلیں ملیں گی۔ اس میں بکثرت مسلمان عالموں اور صوفیوں کے بیانات کو یکجا کر دیا گیا ہے(۵)۔

اجتہاد

اجتہاد کا حق کسے حاصل ہے؟ علماء کو، دانشوروں کو یا عامۃ الناس کو۔ یہ سوال مسلمانوں میں مابہ النزاع رہا ہے۔ بعض حضرات یہ حق علماء کو دیتے ہیں اور ان پر بھی کڑی شرائط عائد کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض نے تو مجتہد کے لئے چودہ علوم کا ماہر ہونا لازمی قرار دیا ہے۔ ان علوم کے بغیر کسی شخص کو اجتہاد کا حق نہیں دیا جا سکتا۔ اس بارے میں ڈاکٹر صاحب بہت وسیع المشرب ہیں۔ ان کے ہاں یہ حق سب لوگوں کو حاصل ہے وہ انفرادی اجتہاد کے بھی قائل ہیں اور اجتماعی لحاظ سے پارلیمنٹ کو مجاز ادارہ قرار دیتے ہیں۔ ڈاکٹر حمیداللہ کہتے ہیں:-

> "جس چیز کے متعلق قرآن و حدیث میں صراحت نہیں ہے اور ایک ایسا مسئلہ پیدا ہوا ہے جس کی ہمیں ضرورت ہے تو اس کے لئے ہم اجتہاد کے ذریعے سے اسلامی نقطہ نظر معلوم کرنے کی کوشش انفرادی طور پر بھی کریں گے اور باہمی مشاورت سے بھی یعنی اجتماعی طور پر بھی سب لوگ متفق ہوئے ہیں تو فبہا، ورنہ ہماری حکومت کو جو رائے اپنے پارلیمنٹ کے ارکان کی کثرت رائے کی بنیاد پر مناسب معلوم ہوگی اس پر عمل کرایا جائے گا"(۶)۔

اجماع

فقہی مآخذات میں اجماع تیسرا بڑا مآخذ ہے لیکن اجماع کیسے ہو؟ موجودہ حالات میں یہ کیونکر ممکن ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر صاحب مرحوم منفرد رائے رکھتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں:

مسلمان علماء کو چاہئے جہاں کہیں بھی ہوں، روس میں ہوں یا امریکہ میں یا پاکستان میں ان کے ساتھ تعلق رکھنے اور ان کے مشوروں سے استفادہ کرنے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ انہیں ایک جگہ رہنے پر مجبور کیا جائے۔ اس کے برخلاف یہ ہو سکتا ہے کہ ہر ملک میں علماء کی ایک انجمن بنے جس کو ایک صدر مرکز سے منسلک کر دیا جائے۔ صدر مرکز کی طرف سے جب ایک سوال کسی ملک کو جائے گا مثلاً فرانس کو، تو فرانس کی انجمن کا سیکرٹری فرانس میں رہنے والے سارے مسلمان ماہرین فقہ اسلامی کو اس کی نقل بھیجے گا اور ان سے کہے گا کہ اس بارے میں آپ اپنی رائے جلد سے جلد مدلل طور پر مطلع کریں۔ جب وہ جوابات جمع ہو جائیں تو ان کا خلاصہ کر کے وہ صدر مرکز کو بھیج دے گا۔ اس طرح صدر مرکز کے پاس تمام ممالک کی انجمنوں سے جوابات آئیں گے۔ صدر مرکز کے سیکرٹریٹ میں ان جوابات کو مرتب کیا جائے۔ اگر اتفاق رائے ہے تو اسے اجماع قرار دیا جائے اور اگر اتفاق رائے نہیں ہے تو صدر مرکز کو چاہئے کہ دوبارہ وہی سوال ساری شاخوں میں گشت کرائے اور مخالف و موافق دونوں طریقوں کی آراء کے ساتھ دلائل کی وضاحت کرے۔ اس مکرر گشت کے موقع پر ممکن ہے جو لوگ ایک خاص رائے رکھتے تھے اب اپنے فریق مخالف کی دلیلوں کو معقول سمجھ کر اپنی رائے بدل دیں۔ جب بار دیگر جوابات آئیں گے اس وقت ان کو دوبارہ شائع کیا جا سکتا ہے۔ اتفاق رائے ہوگیا تو الحمدللہ اور اگر اتفاق رائے نہیں بھی ہوا تب بھی ہم کہہ سکتے ہیں کہ اتنے لوگ یا فلاں فلاں لوگ یہ رائے رکھتے ہیں۔ فلاں فلاں لوگ دوسری رائے رکھتے ہیں، یہ طریقہ قابل عمل ہوگا''(۷)۔

اجماع میں تغیر و تبدل

فقہی مآخذات میں اجماع تیسرا بڑا مآخذ ہے اس کے بارے میں عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ جس بات پر اجماع ہو جائے اس کی تسلیم و تعمیل لازمی ہے۔ اجماع کو دلیل بنا کر اس سے مزید

مسائل سلجھائے جا سکتے ہیں تاہم اجماع کو کوئی فقیہہ یا فقہاء مل کر تبدیل نہیں کر سکتے۔ اس بارے میں ڈاکٹر حمیداللہ مرحوم کی رائے مختلف ہے۔ ان کے نزدیک اجماع کو دوسرے اجماع کے ذریعے تبدیل بھی کیا جا سکتا ہے اور اجماع کی موجودگی میں نیا اجماع بھی لایا جا سکتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ کسی قانون کو یا تو خود قانون ساز بدل سکتا ہے یا اس سے بالاتر شخصیت۔ اس سے کم تر شخصیت کو قانون بدلنے کی اجازت نہیں۔ اگر اللہ نے کوئی حکم دیا ہے تو اللہ ہی اس کو بدل سکتا ہے۔ اسی طرح نبی کے حکم کو یا وہی نبی بدلے گا یا اللہ تعالیٰ یا اللہ کا بھیجا ہوا کوئی دوسرا نبی۔ نبی سے فروتر شخص مثلاً کوئی فقیہہ اسے نہیں بدل سکتا۔ اس لحاظ سے اسلامی قانون کے جو احکام قرآن میں ہیں انہیں کوئی اور شخص نہیں بدل سکتا۔ لیکن ایک فقیہہ کی رائے دوسرا فقیہہ رد کر سکتا ہے اور اپنی رائے پیش کر سکتا ہے۔ مگر یہ چیز انفرادی قیاس یا رائے اور استنباط ہی سے متعلق نہیں ہے بلکہ اجتماعی رائے کے متعلق بھی درست ہے۔ کم از کم حنفی مذہب میں یہ بات قبول کر لی گئی ہے کہ نیا اجماع پرانے اجماع کو منسوخ کر سکتا ہے۔ فرض کیجئے کہ ایک چیز پر اجماع پایا جاتا ہے اجماع کے سامنے ہم سر تسلیم خم کرتے ہیں۔ مگر اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ قیامت تک کوئی شخص اس کے خلاف زبان نہ کھولے۔ اگر کوئی شخص جرأت کر کے ادب کے ساتھ دلیلوں کے ساتھ اس کے خلاف اپنی رائے پیش کرے اور پھر اس نئی رائے کو دوسرے فقہاء بھی قبول کریں تو ایک نیا اجماع ہو جاتا ہے یہ نیا اجماع پرانے اجماع کو منسوخ کر دیتا ہے"(۸)۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم اس بارے میں مشہور حنفی امام ابوالیسر البزدوی کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ بات انہوں نے اپنی کتاب اصول الفقہ میں بیان کی ہے۔ امام ابوالیسر البزدوی چوتھی اور پانچویں صدی کے درمیان بہت بڑے فقیہہ گزرے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے نزدیک امام بزدوی کا یہ قول بہت بڑا انقلابی قدم ہے جس کے ذریعے اجماع مصیبت یا پریشانی کا باعث نہیں بن سکتا۔ اجماع اگر کسی نامناسب چیز پر ہوگیا ہو اور حالات کے بدلنے کی وجہ سے ہم ان پر عمل نہ کر سکتے ہوں تو اس کی گنجائش ہے کہ اجماع کے بدلنے کا بھی ہم سامان پیدا کر لیں اور قیاس کے ذریعے سے ایک نیا اجماع پیدا کر کے پرانے اجماع کو بدل دیں(۹)۔

اسلام کا نظامِ سیاست

اسلامی نظام سیاست کے حوالے سے یہ سوال بڑا اہم ہے کہ اسلام بادشاہی نظام کی تائید کرتا ہے یا جمہوریت پسند ہے یا ان دونوں نظامہائے سیاست کے برعکس کوئی علیحدہ نقطہ نظر رکھتا ہے۔

ڈاکٹر حمیداللہ فرماتے ہیں کہ:

''نظامِ حکومت کیا ہو؟ اس بارے میں اسلام کوئی حکم نہیں دیتا۔ بادشاہت بھی جائز ہے اور اگر جمہوریت ہو تو وہ بھی جائز ہے اور جماعت کی حکومت ہو تو وہ بھی جائز ہے۔ ان سب کو جب اسلام جائز قرار دیتا ہے تو ان حالات میں ہر دور کے اور ہر ملک کے لوگ باہم مشاورت کے ساتھ خود ہی طے کریں گے کہ ہمیں کون سا طرز حکومت اپنے زمانے کے لئے اختیار کرنا چاہئے۔ آپ شائد اس بات کی ضرورت سمجھیں کہ میں بتا دوں کہ میں کیوں بادشاہت کو بھی جائز قرار دیتا ہوں۔ بعض احباب فوراً کہیں گے کہ قرآن مجید میں ملکہ سبا، بلقیس کے ضمن میں ذکر آیا ہے کہ ''ان الملوک اذا دخلوا قریۃ افسدوھا'' (۲۷:۳۴) ''جب بادشاہ کسی بستی میں فاتحانہ داخل ہوتے ہیں تو وہاں فساد برپا کرتے ہیں''۔ اس سے ہمارے بھائی استدلال کریں گے کہ بادشاہت کے خلاف حکم ہے۔ مگر میں بڑے ادب کے ساتھ عرض کروں گا کہ قرآن مجید میں اچھے بادشاہوں کا ذکر بھی ہے اور برے بادشاہوں کا بھی۔ جہاں ایک طرف فرعون اور نمرود جیسے ظالم بادشاہوں کا ذکر آتا ہے وہاں حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ جیسے پیغمبروں کو بھی بادشاہ کا لقب دیا گیا ہے۔ جب ایسے جلیل القدر پیغمبر بادشاہت کر چکے ہیں تو پھر ہم اسے حرام کیسے قرار دے سکتے ہیں۔ قرآن مجید میں یہ آیت جو بلقیس کے سلسلہ میں آئی ہے اس کا جواب میں یہ دوں گا کہ یہ بلقیس کے خیالات تھے جو قرآن نے نقل کئے ہیں، اس سے زیادہ ان کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اگر آپ کے خیال میں بادشاہت مناسب ہے تو اسے اختیار کیجئے۔ آپ کے خیال میں مناسب نہیں ہے تو نہ کیجئے۔ خود ہمارے رسول اکرم ﷺ نبی ہی نہیں ساتھ ساتھ بادشاہ بھی رہے ہیں''(۱۰)۔

جناب ڈاکٹر صاحب کی یہ رائے جمہور علماء سیاست کی آراء سے متصادم ہے۔ بادشاہ کا تقرر عموماً نامزدگی کے ذریعے سے ہوتا ہے جبکہ ریاستی امور میں قرآن کا حکم واضح ہے۔ وہ ''وامرھم شوریٰ

بینھم“ سے دلیل پکڑتے ہیں، معاملات کو باہم مشورے سے طے کرو اور اس کی تائید میں خلفائے راشدین کی تقرری کو پیش کرتے ہیں۔ طبری کے مطابق حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنے آخری وقت میں اپنے حجرے کے دروازے سے مسلمانوں کے مجمع عام کو خطاب کر کے فرمایا:

”ترضون بمن استخلفُ علیکم فانی واللہ ما الوت من جھدی الرای ولاولیت ذاقرابة. وانی استخلف عمر بن الخطاب فاسمعوا له واطیعوا“.

”کیا تم راضی ہو اس شخص سے جس کو میں تم پر اپنا جانشین مقرر کروں۔ خدا کی قسم میں نے رائے قائم کرنے میں بڑا غور وفکر کیا اور کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی اور اپنے کسی رشتہ دار کو مقرر نہیں کیا۔ میں نے عمر بن خطابؓ کو جانشین بنایا ہے۔ پس تم ان کی سنو اور اطاعت کرو“۔

اس پر پورے مجمع میں سے آوازیں آئیں۔ سمعناواطعنا. (ہم نے سنا اور اطاعت کی)(۱۱)۔

اسی طرح حضرت عمرؓ نے وصیت کرتے ہوئے فرمایا: ”من تامرمنکم علی غیر مشورة من المسلمین فاضربوا اعنقه“(۱۲)۔ تم میں سے جو بغیر مشورہ کے خود کو مسلمانوں پر مسلط کرے اس کی سرکوبی کرو۔

اس کے بعد حضرت عبدالرحمٰن ابن عوفؓ نے مدینہ میں الگ الگ لوگوں سے رائے معلوم کی۔ گھر گھر جا کر عورتوں تک سے پوچھا حتیٰ کہ مدارس کے طلبہ تک سے پوچھا۔ مدینہ میں موجود مسافروں سے بھی دریافت کیا۔ وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ عمومی میلان حضرت عثمانؓ کی طرف ہے۔ لہذا اس مشورہ پر آپ نے حضرت عثمانؓ کی خلافت کا اعلان فرمایا (۱۳)۔

خلیفہ چہارم حضرت علیؓ کا انتخاب بھی لوگوں کے مشورہ سے ہی ہوا۔ جب بعض لوگوں نے آپ کی خلافت قبول کرنے کی درخواست کی تو آپ نے فرمایا:

فان بیعتی لاتکون خفیا ولا تکون الاعن رضاً من المسلمین(۱۴)

”میری بیعت خفیہ نہیں ہوگی اور اس کا انعقاد عام لوگوں کی رضامندی کے بغیر ممکن نہیں ہے“

ڈاکٹر صاحب کے مذکورہ خیالات کو سامنے رکھئے تو اس سے درج ذیل نتائج اخذ ہوتے ہیں:-

۱۔ اسلام نے سیاسی حوالے سے کچھ اصول وضع نہیں کئے بلکہ یہ معاملہ وقتی حالات کے تناظر میں مسلمانوں کی صوابدید پر چھوڑ دیا ہے۔

۲۔ اصولی طور پر اسلام کا نظامِ سیاست بادشاہی نظام کی تائید و توثیق کرتا ہے۔

۳۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم بادشاہت کے قائل ہیں اور اس سلسلہ میں توارث کو بھی صحیح خیال فرماتے ہیں، ان کے بقول ''اسلام میں بادشاہت کی بھی اجازت ہے، جہاں بادشاہ کا بڑا بیٹا خود بخود ولی عہد بن جاتا ہے اور ''وورث سلیمان داوٗدؑ' کی آیت قرآنی اس کی اجازت بھی دیتی ہے[۱۵]۔

رئیس حکومت کے حوالے سے ایک اہم بحث اس کے اختیارات کے بارے میں ہے کہ اس کے اختیارات کا دائرہ محدود ہے یا لامحدود۔ اگر محدود ہے تو کس حد تک محدود ہے وہ اختیارات کے استعمال میں کہاں تک پابند ہے اور کہاں تک آزاد ہے۔

ڈاکٹر صاحب اس بارے میں صرف عدل و انصاف کو معیار قرار دیتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

''اسلام میں معین طرزِ حکومت کو لازم قرار نہیں دیا گیا بلکہ عدل و انصاف کو لازم قرار دیا گیا ہے۔ چاہے اس کو کوئی بھی انجام دے۔ اگر آج حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ یا حضرت علیؓ زندہ ہوں تو میں بخوشی انہیں سارے آمرانہ اختیارات سونپنے کے لئے آمادہ ہوں کیونکہ مجھے ان کی خداترسی پر پورا اعتماد ہے''[۱۶]۔

وحی اور نزولِ وحی

وحی اور نزولِ وحی کے بارے میں مستشرقین ہمیشہ غلط فہمی کا شکار رہے ہیں۔ اس حوالے سے انہوں نے انتہائی غیر ذمہ دارانہ بلکہ انتہائی مضحکہ خیز باتیں اسلام اور شارع اسلام محمد ﷺ کے ساتھ منسوب کی ہیں، عموماً مستشرقین وحی کی کیفیت کو بیماری سے تشبیہہ دیتے ہیں۔ جرمن کا مشہور مستشرق اسپرنگر انگریزی دور میں کافی عرصہ ہندوستان میں رہا۔ وہ عربی کا ماہر بھی تھا، علم طب بھی جانتا تھا اس نے سیرت کے موضوع پر جرمنی زبان میں کتاب بھی لکھی۔ اس نے وحی کو مرگی کی علامت قرار دیا ہے کیونکہ نزول وحی کے وقت رسول اکرم ﷺ پر مختلف کیفیات طاری ہو جایا کرتی تھیں۔ کبھی آپ کا چہرہ سرخ ہو جاتا، کبھی سردیوں کے موسم میں آپؐ پسینے سے شرابور ہو جاتے اور آپؐ پر سکتے کا عالم طاری ہو جاتا اور کبھی آپؐ لیٹ جاتے۔ ان تمام کیفیات کی بناء پر مستشرقین نے یہ کہہ دیا کہ یہ ساری علامات بیماری کی ہیں جس کو مسلمان نزول وحی کہتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد حمیداللہ مرحوم اس پر بڑے منفرد انداز میں محاکمہ فرماتے ہیں اور نقلی کی بجائے عقلی دلائل کے ساتھ اس دروغ کا رد کرتے ہیں جو ہمارے نزدیک عالم اسلام میں کسی اور کے حصے میں

نہیں آیا۔ آپ فرماتے ہیں:

''میں نے وہ حدیثیں جمع کیں جن میں وحی کے نزول کے وقت کا مشاہدہ مختلف صحابیوں سے مروی ہے آپؒ کی اس طویل بحث کا خلاصہ یہ ہے''

وحی کے نزول کے وقت رسول اللہ ﷺ کا وزن بڑھ جاتا اور اتنا بڑھ جاتا کہ کسی دوسرے شخص سے اس کا تحمل بھی ناممکن ہو جاتا۔ جیسا کہ حضرت زید بن ثابتؓ کہتے ہیں لوگوں کی کثرت تھی اور لوگ قریب قریب بیٹھے تھے۔ میں رسول اللہ ﷺ کے پاس اس طرح بیٹھا تھا کہ آپ کا زانو میرے زانو پر تھا کہ اسی دوران نزول وحی کی کیفیت شروع ہوگئی مجھے اتنا بوجھ محسوس ہوا کہ مجھے خوف ہوا کہ میری ران کی ہڈی چیخ کر ٹوٹ جائے گی۔ اگر رسول اللہ ﷺ کی ذات نہ ہوتی تو میں چیخ کر اپنا پاؤں کھینچ لیتا۔ کیونکہ میرے لئے ناممکن تھا کہ میں آپ کا بوجھ برداشت کر سکوں۔ ڈاکٹر حمیداللہ صاحب استدلال کرتے ہیں کہ مرگی میں مریض کا وزن اس طرح نہیں ہوتا۔

دوسرا وہ یہ فرماتے ہیں کہ مرگی کا مریض تشنج کی حالت میں ہوتا ہے، ہاتھ پاؤں مارتا ہے، بے قرار ہوتا ہے اور اس کی زبان سے کچھ آوازیں نکلتی ہیں جو بالکل ناقابل فہم ہوتی ہیں جبکہ نبی اکرم ﷺ کے ہاں نزول وحی میں ایسی کیفیت ہرگز نہیں ہوتی بلکہ نزول وحی کا دورانیہ ختم ہونے کے بعد آپؐ بالکل ہشاش بشاش ہوتے ہیں اور جو وحی نازل ہوئی تھی اس کے الفاظ پوری طرح لوگوں تک منتقل فرماتے ہیں اور پڑھ کر سناتے ہیں۔

تیسری بات ڈاکٹر صاحب یہ کہتے ہیں کہ مرگی والے شخص کی اولاد میں بھی یہ مرض منتقل ہوتا ہے لیکن نبی اکرم ﷺ کو اللہ نے چھ سات لڑکے لڑکیاں عطا کیں اور آپ کی لڑکیوں کی اولاد اب تک دنیا میں باقی ہے اور مرض کے توارث کا کوئی واقعہ ہمیں تاریخ میں نہیں ملتا۔

چوتھی بات ڈاکٹر صاحب یہ فرماتے ہیں کہ مرگی کا مریض بیماری کے حملہ کے دوران بے خود ہوتا ہے، ہاتھ پاؤں مارتا ہے لیکن رسول اکرم ﷺ پر ایسی کیفیت کبھی طاری نہیں ہوئی بلکہ نہایت اطمینان کی حالت میں ہوتے حتیٰ کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ کھانا تناول فرما رہے تھے۔ آپ کے ہاتھ میں گوشت کا ٹکڑا تھا کہ وحی کا نزول شروع ہوگیا۔ نزول وحی کا دورانیہ مکمل ہوا لیکن گوشت کا ٹکڑا بدستور آپ کے ہاتھ میں رہا، گرا نہیں یعنی آپؐ کو اپنی ذات پر پورا کنٹرول رہا(۱۷)۔

داڑھی کا وجوب یا عدم وجوب

برصغیر پاک و ہند میں داڑھی کا مسئلہ بہت حساس رہا ہے۔ داڑھی واجب ہے یا سنت؟ سنت ہے تو مؤکدہ یا غیر مؤکدہ؟ اس حوالے سے داڑھی کی مقدار بھی اہل علم کے ہاں موضوع بحث رہی ہے۔ اس بارے میں ڈاکٹر حمیداللہ مرحوم کی رائے منفرد تھی۔ ان سے ایک سائل نے سوال کیا۔ داڑھی عرب کا خاص رواج تھا یہاں تک کہ مشرک لوگ بھی داڑھی رکھتے تھے، رسم و رواج شرعی نقطہ نظر نہیں بن سکتے لیکن آج کل داڑھی کو سنت مؤکدہ سمجھا جاتا ہے۔ ڈاکٹر حمیداللہ نے فرمایا:

''مشرکین عرب نہیں کارل مارکس بھی داڑھی رکھتا تھا۔ انڈوچائنا کے ہوچی منہ کی بھی داڑھی تھی، لینن کی بھی داڑھی تھی۔ آپ پیرس آئیں گے تو دیکھیں گے کہ ہزاروں فرانسیسی غیر مسلم داڑھی رکھتے ہیں۔ آپ داڑھی کے فرنچ کٹ سے بھی واقف ہوں گے۔ میں اس کا قائل نہیں ہوں کہ داڑھی دوسروں کی تقلید میں رکھی جائے آپ بھی قائل نہیں ہوں گے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس بارے میں قرآن و حدیث میں کیا احکامات ہیں؟ قرآن مجید میں ایک جگہ اشارۃً ذکر آیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہِ طور سے نیچے اُترے تو دیکھا کہ ان کی قوم یعنی یہودی گاؤ پرستی میں مشغول ہیں۔ وہ اپنے بھائی حضرت ہارونؑ کو اپنا نائب بنا کر چھوڑ گئے تھے۔ ان پر خفا ہوئے۔ قرآنی الفاظ (الاعراف-۱۵۰) ہیں کہ حضرت ہارونؑ کی داڑھی کو کھینچ کر ان کے ساتھ سختی کا برتاؤ کیا۔ یہ اشارۃً ذکر ہے یعنی داڑھی رکھنا پیغمبروں کی سنت ہے۔ حدیث میں اس سے زیادہ صریح الفاظ ملتے ہیں: ''داڑھی رکھو'' اس حدیث اور سنت رسول کے پیش نظر داڑھی رکھنا محض رسم و رواج نہیں بلکہ اسلامی حکم بن جاتا ہے۔ حکم کے متعلق آپ کو معلوم ہوگا کہ درجات پائے جاتے ہیں یعنی اگر فرض کیجئے کہ قرآن میں صیغہ امر استعمال کر کے کہا گیا ہے کہ ''زکوٰۃ دو'' اور وہی صیغہ امر استعمال کر کے یہ بھی کہا گیا ہے کہ ''خیرات کرو'' تو ظاہر ہے کہ دونوں کا حکم یکساں نہیں ہے۔ اگر زکوٰۃ دینے سے میں انکار کروں تو حضرت ابوبکر صدیقؓ تلوار کھینچ کر مجھے مجبور کر سکیں گے کہ زکوٰۃ دوں لیکن اگر میں خیرات دینے سے انکار کر دوں تو حضرت ابوبکر صدیقؓ ممکن ہے مجھے کہیں کہ بُرا مسلمان ہے لیکن مجھے تلوار کے ذریعے مجبور نہیں کریں گے یعنی احکام میں درجہ بندی ہوتی ہے اس لحاظ سے ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ داڑھی رکھنا بے شک اسلامی حکم ہے لیکن اس درجے کا حکم نہیں ہے جیسے اللہ کو

ایک ماننا یا جیسے رسول اللہ ﷺ کو اللہ کا نبی ماننا یا مثلاً نماز پڑھنا اورروزہ رکھنا وغیرہ اس کا درجہ نسبتاً فروتر ہوگا۔

عورت کی امامت

نماز باجماعت میں عورت امام بن سکتی ہے یا نہیں؟ جمہور علماء اس بارے میں عدم جواز کے قائل ہیں۔ بعض کے ہاں نفلی نماز میں وہ امام بن سکتی ہے وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ وہ آگے کھڑی نہ ہو بلکہ صف کے درمیان میں کھڑی ہو کر امامت کرائے اور کوئی مرد کسی عورت کا مقتدی کسی صورت نہیں بن سکتا لیکن اس بارے میں ڈاکٹر حمیداللہ مرحوم عورت کی امامت کو ہر صورت جائز خیال کرتے ہیں ان کے نزدیک عورت مرد کی امامت بھی کرا سکتی ہے اور باقاعدہ آگے کھڑی ہوکر جماعت میں امام بھی بن سکتی ہے کوئی مضائقہ نہیں ہے، وہ فرماتے ہیں:

''پیرس میں--- ایک افغان لڑکی طالب علم کے طور پر آئی تھی۔ ہالینڈ کا طالب علم جو اس کا ہم جماعت تھا۔ اس پر عاشق ہوگیا۔ عشق اتنا شدید نکلا کہ اس نے اپنا دین بدل کر اسلام قبول کر لیا۔ ان دونوں کا نکاح ہوا۔ اگلے دن وہ لڑکی میرے پاس آئی اور کہنے لگی کہ بھائی صاحب میرا شوہر مسلمان ہوگیا ہے اور وہ اسلام پر عمل بھی کرنا چاہتا ہے لیکن اسے نماز نہیں آتی اور اس کا اصرار ہے کہ میں خود امام بن کر نماز پڑھاؤں۔ کیا وہ میرے اقتداء میں نماز پڑھ سکتا ہے؟ میں نے اسے جواب دیا کہ اگر آپ کسی عام مولوی سے پوچھیں گی تو وہ کہے گا کہ یہ جائز نہیں لیکن میرے ذہن میں رسول اللہ ﷺ کے طرزِ عمل کا ایک واقعہ حضرت ورقہ ؓ کا ہے۔ اس لئے استثنائی طور پر تم امام بن کر نماز پڑھاؤ۔ تمہارے شوہر کو چاہئے کہ مقتدی بن کر تمہارے پیچھے نماز پڑھے اور جلد از جلد قرآن کی ان سورتوں کو یاد کرے جو نماز میں کام آتی ہیں۔ کم از کم تین سورتیں یاد کرے اور تشہد وغیرہ یاد کرے پھر اس کے بعد وہ تمہارا امام بنے اور تم اس کے پیچھے نماز پڑھو''(۱۹)۔

حضرت ورقہ ؓ کا واقعہ بیان کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں کہ:-

''ام ورقہ ؓ حافظہ تھیں، ان کو رسول اللہ ﷺ نے ان کے محلے کی مسجد کا امام مقرر فرمایا تھا۔ ان کے پیچھے مرد بھی نماز پڑھتے تھے، ان کا مؤذن ایک مرد تھا۔ ظاہر ہے کہ مؤذن بھی بطور مقتدی ان کے پیچھے نماز پڑھتا ہوگا۔ حضرت اُم ورقہ حضرت عمر ؓ کے زمانہ تک

زندہ رہیں اور مسجد میں امامت کے فرائض سرانجام دیتی رہیں۔ جس سے اس بات کا امکان بھی ختم ہو جاتا ہے کہ شاید یہ حکم رسول اللہ ﷺ نے بعد میں منسوخ فرمایا ہو"(۲۰)۔

البتہ ڈاکٹر صاحب اس جملے کا اضافہ فرماتے ہیں کہ بعض اوقات عام قاعدے میں کوئی استثناء کی صورت پیش آ جاتی ہے ممکن ہے رسول اللہ ﷺ نے حضرت اُم ورقہؓ کا تقرر بھی کسی ایسی ہی استثنائی صورت کے پیش نظر فرمایا ہو۔

جامع القرآن

حضرت عثمانؓ کو جامع القرآن کہا جاتا ہے اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ انہوں نے قرآن کو جمع کیا۔ اس کی تاویل ہمارے مؤرخوں نے یہ کی ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کو ایک ہی قرآن پر جمع کیا جو اختلاف لوگوں میں پایا جاتا تھا اس سے ان کو بچانے کے لئے مکہ معظمہ والے تلفظ والے قرآن کو انہوں نے نافذ کیا اور رسول اکرم ﷺ نے اگر یہ اجازت دی تھی کہ مختلف قبائل کے لوگ مختلف الفاظ کو مختلف انداز میں پڑھ سکتے ہیں تو اب اس کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہی کیونکہ مکہ معظمہ کی عربی اب ساری دنیائے اسلام میں نافذ اور رائج ہو چکی ہے۔ اس طرح حضرت عثمانؓ نے مسلمانوں کو ایک قرآن مجید پر جمع کیا(۲۱)۔

ڈاکٹر حمیداللہ مرحوم کی مذکورہ بالا رائے جمہور علماء کی رائے سے مختلف ہے۔ کیونکہ اختلاف قراءت کا ثبوت احادیث صحیحہ سے ملتا ہے اور پھر جس کی اجازت رسول اکرم ﷺ نے خود اللہ تعالیٰ سے مانگی ہو اور آپ کی طلب ہی کے نتیجہ میں سبعۃ احرف میں تلاوت کی اجازت ملی ہو اس کو منسوخ یا تبدیل کرنے کا اختیار کس کو حاصل ہو سکتا ہے؟ ظاہر ہے یہ اختیار بشمول صحابہ کرام و خلفائے راشدین کسی کو حاصل نہیں ہے۔ اس حوالے سے تمام اسلاف یہ رائے رکھتے ہیں کہ حضرت عثمان غنیؓ نے جو قرآن مجید اپنی نگرانی میں لکھوائے وہ سب سبعۃ احرف کے مطابق تھے۔ اسی لئے یہ اجماعی اور اتفاقی امر قرار پایا کہ آئندہ جو قرآن مجید بھی لکھا جائے وہ مصاحف عثمانی ہی کے مطابق ہو اور رسم الخط کے اعتبار سے بھی مصاحف عثمانی کے مطابق ہونا چاہئے۔ اس کی عدم پیروی تحریف و تصریف پر محمول قرار دی جائے گی۔

بعد از وفات مروجہ رسومات

مسلمانوں میں بعد از وفات بہت سی رسوم مروج ہیں مثلاً قل خوانی، دسواں، چالیسواں وغیرہ۔ بعض محتاط علماء ان تمام رسومات کو بدعت قرار دیتے ہیں جبکہ بعض کے نزدیک ان میں کوئی قباحت نہیں ہے بلکہ انہی دو نظریات کے سبب اہل السنہ میں برصغیر پاک و ہند کے اندر دو مستقل فرقے بھی بن گئے ہیں۔ اس بارے میں ڈاکٹر حمیداللہ مرحوم فرماتے ہیں:

> ''اگر کسی کی وفات کے تیسرے دن، دسویں دن، چالیسویں دن ہم کچھ کرنا چاہیں تو وہ کام یہ ہونا چاہیئے کہ قرآن مجید کی تلاوت کریں اور اس کا ثواب متوفی کو پہنچانے کی اللہ سے دعا کریں۔ اس میں کوئی امر مانع نہیں ہے، چاہے ہر روز کریں، چاہے ہر سال، چاہے ابتداء متعدد بار کریں۔ کوئی امر مانع نہیں ہوتا اور میرے مرنے کے بعد اگر آپ میرے لئے بھی دعا کریں تو میں آپ کا ممنون ہوں گا''(۲۲)۔

حوالہ جات

۱۔ ڈاکٹر حمید اللہ مرحوم ''خطبات بہاولپور''، ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد ۱۹۹۲ء، صفحہ ۲۵۲

۲۔ ایضاً، ص ۲۵۲

۳۔ ایضاً، ص ۲۵۳

۴۔ ایضاً، ص ۲۵۴

۵۔ ایضاً، ص ۱۸، ۲۱۷

۶۔ ایضاً، ص ۱۳۷

۷۔ ایضاً، ص ۱۱۲

۸۔ ایضاً، ص ۳۷، ۱۳۶

۹۔ ایضاً، ص ۱۳۷

۱۰۔ ایضاً، ص ۱۱۱

۱۱۔ طبری، ص ۳۱۳/۲

۱۲۔ محمد حسین ہیکل الفاروق، ص ۳۱۳/۲

۱۳۔ مودودی، اسلامی ریاست، ص ۳۳۸

۱۴۔ طبری، ص ۳/ ۴۵

۱۵۔ خطبات، ص ۱۱۶

۱۶۔ ایضاً، ص ۱۱۶

۱۷۔ ایضاً، ص ۹۷، ۱۹۲

۱۸۔ ایضاً، ص ۱۵، ۱۱۴

۱۹۔ ایضاً، ص ۳۶

۲۰۔ ایضاً، ص ۳۵

۲۱۔ ایضاً، ص ۲۷، ۲۶

۲۲۔ ایضاً، ص ۲۵۴